عبدالسلام عادلؔ
ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال

ڈاکٹر الیاس عشقی اور وادیٔ مہران

DR ILYAS ISHQI AUR WAADI-E-MEHRAN

Dr. Ilyas Ishqi was born in Jaipur, India, and migrated to Sindh, Pakistan after partition in 1947. He was greatly contributed to the literature of Persian, Punjabi, Urdu and Sindhi. With special focus on his contributions to the Sindhi language, the prominent writers of Sindhi and the literature of Sindh, this article briefly reviews his life, interest in and services for the literature of different languages during his service postings in several cities.

Dr. Ilyas Ishqi left footprints of his remarkable work in every area he touched in language and literature. Similarly, he proved his deep relationship with the people of Sindh, and its language and literature. He not only wrote poetic translation of the works of notable poets of Sindh from ancient and modern era. His translation work was published with a title "Mouj Mouj Mehran" in 1973 by Anjuman-e-Traqqi-e-Urdu (Organization for the Development of Urdu). His Sindhi poetry, essays and articles are commonly found in Sindhi Language magazines. His articles and essays written in Sindhi are of high merit, which speaks volumes of his love and devotion to Sindhi Language and literature.

Expressing his affection for the people of Sindh, eminent writers of Sindh its language and literature, Dr. Ishqi introduced literary wealth of Sindhi language to the society of Sindhi as well as Urdu literature.

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج اینڈ پوسٹ گریجویٹ کالج، حیدرآباد abdussalaamaadil@gmail.com
☆ پروفیسر شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو urdusindh@yahoo.com

ڈاکٹر الیاس عشقی (۱۹۲۲ء۔ ۲۰۰۷ء) کا نام محمد الیاس خان یوسف زئی اور تخلص عشقی ہے۔ وہ ۲ جون ۱۹۲۲ء کو جے پور، راجستھان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ بی۔اے اور ایم۔اے اردو آگرہ یونیورسٹی سے کیا اور پی ایچ ڈی کی سند ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی زیرِ نگرانی ''اردو شاعری پر مغرب کے اثرات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر سندھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ڈاکٹر الیاس عشقی کا علمی و ادبی سفر قیامِ پاکستان سے قبل شروع ہوا اور نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران آپ نے متعدد زبانوں میں شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی، فارسی، سندھی، پنجابی اور اردو میں مضامین و مقالات لکھے جو ایران، ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ادبی دنیا میں آپ ماہرِ لسانیات، محقق، مترجم اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں آپ کا شعری مجموعہ ''شعرِ آشوب'' (۱۹۷۹ء) اور اردو شاعری کے دو مجموعے ''دوہا ہزاری'' (۲۰۰۳ء) اور ''گنبدِ بے در'' (۲۰۰۶ء) جب کہ سندھی شعراء کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ ''موج موج مہران'' (۱۹۷۳ء) شائع ہو چکا ہے۔ نثری تحقیقات و تخلیقات کے حوالے سے آپ کی ایک کتاب ''آوازِ لطیف'' (۲۰۱۴ء) میں اور دوسری ''اردو شاعری پر مغرب کے اثرات'' (۲۰۱۹ء) میں شائع ہوئی۔ ان کا جملہ نثری سرمایہ غیر مدوّن تھا جسے مرتب کر لیا گیا ہے۔ ان میں متنوع موضوعات پر تحقیقی، تنقیدی، شخصی اور مختلف زبانوں کے حوالے سے مضامین و مقالات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف کتب پر مقدمات، دیباچے، فلیپس اور تبصرے بھی لکھے۔ ڈاکٹر الیاس عشقی کا انگریزی، فارسی، سندھی، پنجابی اور اردو میں قلم بند کیا گیا یہ کثیر الجہتی سرمایہ اب بتدریج شائع کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر الیاس عشقی نے یوں تو مختلف النوع شاہکار تخلیق کیے مگر آپ نے وادیٔ مہران کے حوالے سے جو قابلِ قدر کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس مقالے کا حصہ ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد ایوارڈز دیے گئے اور حکومتِ پاکستان نے بھی ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء کو ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔ ۱۲ جنوری ۲۰۰۷ء کو علم و ادب کے آسمان کا یہ دمکتا سورج اپنا سفر مکمل کر کے غروب ہو گیا۔

ڈاکٹر الیاس عشقی کو کئی زبانوں مثلاً ہندی، مارواڑی، اردو، سندھی، پنجابی، فارسی، سرائیکی اور انگریزی پر دسترس حاصل تھی۔ مختلف زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے خود الیاس عشقی نے لکھا:

> ''راجستھان میں تھا تو راجستھانی جانتا تھا، جو شہر ہندی کا مرکز تھا وہیں سے ہندی شاعری سے دل چسپی ہوئی۔ اکثر مشاعروں میں کلام پڑھا۔ ہندی لکھنا پڑھنا دوستوں کی صحبت میں آ گیا۔ ریاست کی ایک زبان برج بھاشا بھی ہے جو شاعری کی زبان بھی ہے، اس میں شُد بُد ہو گئی۔ فارسی زبان کا گھر میں چرچا رہتا تھا، لہٰذا یہ زبان بھی سیکھ گیا۔ انگریزی پڑھی، پاکستان میں آئے تو پنجابی ادب اور شاعری سے دل چسپی ہوئی۔ کچھ لکھنا بھی شروع کیا جو رسائل میں بھی شائع ہوا۔ اب پنجابی ادب کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے۔ سندھی بولی، پڑھی لکھی۔ شاہ عبداللطیفؒ کے علاوہ تاریخ سندھ، سندھی موسیقی اور سندھی زبان پر لکھے گئے مضامین کئی رسالوں میں شائع ہوئے۔ شاعری بھی معتبر رسالوں میں چھپی۔ سرائیکی زبان کے متعلق مضامین لکھے۔ کبھی کبھی انہیں مضامین پر انگریزی میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالہ ''زمانہ'' کانپور سے لکھنا شروع کیا۔''[۱]

سلطان جمیل نسیم خود کو الیاس عشقی سے محبت کرنے والوں میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''عشقی صاحب کا ذہن علمی ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کا علم سمیٹ لیتے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی تو گویا ان کے گھر کی زبانیں ہیں۔ پشاور میں رہے تو پشتو اہلِ زبان کی طرح لکھنے اور بولنے لگے جیسے وہیں کے ہیں اور ہیں وہیں کے خالص یوسف زئی پٹھان۔ جب پشتو جانتے ہیں تو بھلا ہندکو کو کیوں چھوڑا ہوگا۔ پنجابی زبان و ادب سے آگاہ اس لیے کہ لاہور میں بھی قیام رہا ہے۔'' ۲

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جب انھوں (سلطان جمیل نسیم) نے اپنے ڈراموں کی کتاب ملتان میں اپنے ایک دوست کو بھیجی تو انھوں نے لکھا :

''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کتاب کا انتساب الیاس عشقی صاحب کے نام کیا ہے۔ ہم ملتان والے عشقی صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ایسا عالم فاضل شخص ان کے جانے کے بعد ملتان ریڈیو کو میسر نہیں ہوا۔'' ۳

ملازمت کا آغاز ہجرت سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب وہ ''مہاراجہ کالج''، جے پور میں ایم اے اردو کے آخری سال میں طالب علم تھے، اسی کالج کے لیے لیکچرر کی حیثیت سے منتخب کر لیے گئے تھے۔ سیدہ محسنہ خاتون نقوی نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ ۹، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو الیاس عشقی نے کالج میں لیکچرر کا منصب سنبھال لیا ۴ لیکن ڈاکٹر ابراہیم خلیل کا خط پانے کے بعد آپ ملازمت چھوڑ کر اپنے والد کے پاس پاکستان (کوٹری سندھ) آ گئے۔ کوٹری سے ایک ادبی رسالہ احسان عظیم صدیقی (مرحوم) کی زیرِ ادارت نکلتا تھا۔ الیاس عشقی کی تدفین کے وقت ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ہجرت کر کے جب الیاس عشقی پاکستان آئے اور کوٹری کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا تو اسی زمانے میں انھوں نے کوٹری کے اسکول میں کچھ عرصے تک تدریس کے فرائض بھی انجام دیے جس کے وہ چشم دید گواہ ہیں۔ تاہم اسکول سے اس طرح کی دستاویزی شہادت نہ مل سکی۔ پاکستان آمد سے قبل آپ پروفیسر اردو کے لیے انٹرویو بھی دے چکے تھے اور یہاں کامیابی کی اطلاع بھی ملی مگر پھر آپ واپس ہندوستان نہیں گئے۔ پاکستان ہجرت کے حوالے سے الیاس عشقی لکھتے ہیں کہ :

''۱۹۴۸ء میں پاکستان آنا پڑا۔ دو سال بیکاری میں گذرے۔ ایک سال سے زیادہ والدہ کی علالت چلی پھر ان کا انتقال ہو گیا۔'' ۵

دوانِ ملازمت ادبی سفر :

ڈاکٹر الیاس عشقی کو علم و ادب سے ذوق و شوق گھر کے ماحول کی وجہ سے بچپن ہی سے تھا۔ آپ کے دادا فضل نبی خان شفا کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ خود والد گرامی علامہ رزمی جے پوری ادبی حلقوں کی ایک ممتاز و معروف شخصیت تھے۔ والدہ بھی زبان دانی اور شعر و سخن کی فہم و فراست میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ وہ اکثر ذکر کرتے تھے کہ وہ کوئی ادیب وغیرہ نہیں ہیں۔ البتہ جو مضامین (جنھیں بعض اوقات وہ مضامین ہی سے خارج کرتے تھے) لکھے ہیں یہ دوست احباب کی خواہش یا طلب پر لکھے ہیں۔ جب بھی کسی دوست/ احباب نے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی یا زور دیا تو انھیں کچھ نہ کچھ لکھ کر دے دیا۔ باقاعدہ لکھنے کا ایسا شوق کبھی نہیں

رہا۔ وہ عجز اور انکساری کے سبب خود کو ادیب/نثر نگار نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کی کاپی کبھی اپنے پاس محفوظ نہیں کی۔ جو سرمایہ شائع ہو گیا وہ منظرِ عام پر آ گیا اور جو کسی نے لکھوایا مگر شائع نہیں کیا وہ ضائع ہی ہو گیا۔[۶]

ملازمت کے دوران آپ نے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی صلاحیتوں کو نکھارا۔ تقریباً ہر جگہ آپ کو اردو کے معروف اہلِ قلم اور ادیب ملتے رہے اور آپ کے ادبی حلقے میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ سندھ میں بھی ان کی ملاقات مشاہیرِ علم و ادب سے رہی۔ ان میں مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ، علی احمد تالپور، رسول بخش تالپور، حافظ مبارک علی شاہ، نامدار وکیل، این اے بلوچ، تنویر عباسی، مولانا غلام محمد گرامی، اکبر علی شاہ، غلام مصطفیٰ خاں، شیخ ایاز، غلام مصطفیٰ قاسمی، غلام علی الانا وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ پیر حسام الدّین راشدی سے بھی نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ آپ نے استاد اختر انصاری اکبر آبادی کے رسالے ''نئی قدریں'' کی مشاورت کی۔ خانۂ فرہنگ ایران سے تعلق رہا اور انھوں نے ''دوستدارانِ فارسی'' کے نام سے ایک انجمن بنائی اور الیاس عشقی کو اس کا صدر بنایا اور ساتھ ہی اپنے مجلّہ کا مدیر بھی مقرر کیا۔

ڈاکٹر الیاس عشقی نے ''جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے'' کے مصداق وادیٔ مہران سے بھی اپنے تعلق کو بخوبی نبھایا۔ سندھ میں رہتے ہوئے انھوں نے سندھی زبان اور اہلِ سندھ سے اپنی بھرپور محبت کا اظہار فرمایا۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ سندھی زبان میں شاعری کی بلکہ سندھی زبان کے معروف قدیم و جدید شعرا کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا جسے ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقیٔ اردو نے ''موج موج مہران'' کے نام سے شائع کیا جب کہ آپ کی سندھی شاعری سندھی زبان کے مختلف جرائد و رسائل میں بکھری ہوئی ہے۔ اسی طرح سندھی زبان میں لکھے گئے مضامین و مقالات بھی سندھی زبان کے مقبول جرائد و رسائل میں اپنی بہار دکھا رہے ہیں ؎ جو سندھی زبان و ادب سے آپ کی محبت اور لگاؤ کی منہ بولتی تصویر ہے۔

ڈاکٹر الیاس عشقی نے وادیٔ مہران سے اپنی محبت اور دلی لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے اہلِ سندھ، سرزمینِ سندھ اور سندھی زبان کے ادبی سرمائے کو اردو دان طبقے کے لیے اردو زبان میں بھی قلم بند فرمایا۔ اس حوالے سے دستیاب مضامین و مقالات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

☆ نسوانیت کی آواز
☆ سندھی روایتی شاعری — دسمبر ۱۹۶۶ء
☆ شاہ عبداللطیف کی شاعری — مئی، جون ۱۹۷۳ء
☆ شاہ کا رسالہ اور سندھی موسیقی — مئی، جون ۱۹۷۳ء
☆ جامع کمالات امیر خسرو: سندھی زبان اور سندھی موسیقی — جنوری، فروری ۱۹۷۶ء
☆ شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سندھی موسیقی — مئی ۱۹۷۸ء
☆ رسالہ (سندھی روایت میں اردو کلام) — اگست ستمبر ۱۹۸۳ء

☆ سندھی شاعری کے تراجم دسمبر۱۹۸۴ء

☆ اردو رسالے کا ایک باب، سریمن کلیان ستمبر۱۹۸۷ء

☆ سرکاپایتی نومبر۱۹۸۸ء

☆ سندھی زبان اور اس کے الفاظ

☆ چھوکرا۔چھوکری فروری۱۹۹۳ء

☆ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حقیقی عظمت ستمبر۱۹۹۶ء

☆ موئن جودڑو (حقیقت اور افسانہ) دسمبر۲۰۰۲ء

ڈاکٹر الیاس عشقی نے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ان کے کلام کے حوالے سے مختلف پہلوؤں سے مضامین تحریر کیے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے شاہ کے کلام کے حوالے سے ایسے مضامین لکھے ہیں کہ سندھی زبان میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔ وہ مضامین آصف فرخی صاحب کے پاس تھے جو بوجوہ اس درجے تاخیر کا شکار ہوئے کہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکے۔ الیاس عشقی کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی پروفیسر روزی صاحبہ نے وہ مضامین ان سے حاصل کر کے زیورِطبع سے آراستہ کیے اور ۲۰۱۴ء میں ''آوازِ لطیف'' کے نام سے ان کی اشاعت عمل میں آئی۔ ''آوازِ لطیف'' کے پیش لفظ ۸ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی سے متعلق لکھے گئے مضامین کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے شاہ لطیف کی شاعری اور فن کے بارے میں جتنے مضامین لکھے ہیں وہ سب کسی نہ کسی سوال کے مفصل جواب میں قلم بند ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کیسے شاعر ہیں؟ جس کے مفصل جواب کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ وقت لیکن اس سوال کا جواب اس کتاب میں مختلف مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا کلام رسالے میں ہے جو صرف شاہ لطیف ہی کہہ سکتے تھے اور کسی اور شاعر کے کلام میں اس قسم کے اشعار موجود نہیں ہیں۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ بڑے شعرا کا بہترین کلام ایسا ہی ہوتا ہے جو ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن سوال کی نوعیت اور دریافت کرنے والوں کے مقصد کو نظر میں رکھ کر یہ بات بڑے وثوق اور پوری ذمّے داری سے کہی جا سکتی ہے کہ شاہ لطیف ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کو سندھ کی ثقافت اور دیہاتی زندگی سے دلی لگاؤ تھا۔ ان کا ایک قدم کلاسیکی شاعری کی زمین پر تھا۔ اس لیے جہاں ان کے کلام میں شاعری دیہاتی رنگ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس کی مثال ان کے علاوہ کہیں اور ملنی شاید ممکن نہیں ہے۔'' (ص۔۱۵)

کتاب کے مشمولات میں پیش لفظ کے علاوہ مشرق کی آواز، تصوف کی آواز، شاعر کی آواز، دیہات اور دیہاتی فیلسوف کی آواز، نسوانیت کی آواز، علم کی آواز، فن کی آواز، نغمے کی آواز، منفرد آواز، ضمیر کی آواز اور حرفِ آخر کے علاوہ ضمیمے میں شاہ کے مختصر حالاتِ زندگی، شاہ صاحب کی شادی خانہ آبادی (عشق کی حقیقت)، اعترافِ لطیف (نظم)، الیاس عشقی (اخلاقی اور روحانی سبق) شاہ کا مذہب (مضمرات)، شاہ اور مستشرقین، شاہ کے رسالے کے خطی اور طبع شدہ/مطبوعہ (لیتھو اور ٹائپ کے) نسخے، شاہ لطیف پر

جدید تحقیق، شاہ لطیف کے ادبیات کا وزن اور سندھی تلفظ کے مسائل اور مالہٗ وما علیہ شامل ہیں۔اس کے بعد مذکورہ مضامین کی صراحت فرماتے ہوئے انھوں نے پیش لفظ ہی میں لکھا ہے کہ:

''میں ایک آواز کی بازگشت طرح طرح سنتا رہا اور وہی آواز میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔مطمئن ہوں کہ جن آوازوں نے مجھے مبہوت کر دیا تھا وہ آپ کو بھی ضرور متاثر کریں گی۔میں نے مرشد کی ایک آواز میں جتنی آوازیں سنی ہیں ان میں اضافہ بھی ہوسکتا تھا مثلاً حب وطن کی آواز، سیاست کی آواز، مناظرِ فطرت کی آواز، غریب ومظلوم انسان کی آواز اور ناصح کی آواز وغیرہ، لیکن اس سے بات کو طول دینے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا اور پھر یہ آوازیں ان آوازوں میں بھی سنی جاسکتی ہیں جو میں نے آپ کو سنوائی ہیں۔'' (ص۔۱۹)

ڈاکٹر الیاس عشقی نے وادیٔ مہران کی زبان وادب اور یہاں کے لوگوں سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان میں جو مضامین ومقالات قلم بند فرمائے یہاں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اردو قارئین کے لیے بھی وادیٔ مہران اور یہاں کے زبان وادب کو کس قدر تفصیل وتحقیق کے ساتھ قلم بند فرمایا ہے۔

''نسوانیت کی آواز'' [۹] شاہ عبداللطیف بھٹائی [۱۰] کی شاعری میں پائے جانے والے نسوانی کرداروں کے حوالے سے ایک تحقیقی وتنقیدی مقالہ ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ شاہ کے نسوانی کرداروں میں کوئی خاص صفت یا کمزوری اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ان کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔انھوں نے واضح کیا ہے کہ شاہ کے کلام میں عورتوں کے کردار کس قدر ابھر کر سامنے آئے ہیں کہ آج تک کسی نے مرد کرداروں کو بھی نہ تو اس قدر اہمیت دی ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں اس طرح سوچا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شاہ نے جن گیارہ عورتوں (سسی، مومل، لیلا، موکھی، سورٹھ، نوری، مارُئی/ ماروی، باگھی، مہررانی، ڈھولا مارئی اور سُہنی) کے کردار پیش کیے ہیں۔وہ اپنی کسی نہ کسی خوبی کی وجہ سے منفرد ہیں اور ہر نسوانی کردار میں ایک ایسی صفت پائی جاتی ہے کہ وہ جس عورت میں ہو وہ ایک اچھی عورت کی مثال ہوگی اور ان سب عورتوں کی آوازوں کو جمع کریں تو شاہ کے تصور کی عورت کی آواز بن جائے گی۔

الیاس عشقی نے جس قدر باریک بینی کے ساتھ نسوانی کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے شاہ کے کلام کا بہت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر الیاس عشقی کے ''سندھی روایتی شاعری'' [۱۱] کے عنوان سے لکھے گئے اس مضمون میں سندھ میں ہونے والی شاعری اور موسیقی خصوصاً کلاسیکی موسیقی سے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔مختلف سُروں کا بیان ہے اور راگوں کی تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کون سے گیت کا خیال اور داستانیں کن سُروں میں گائی جاتی ہیں۔ان سُروں کا سندھ کے علاقے سے گہرا تعلق ظاہر کیا ہے اور شاعری سے ان کے تعلق کی مثالیں دی ہیں۔شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام اور بیان کردہ داستانوں کے موضوعات اور موسیقی کے تعلق کو بھی بیان کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے کئی سروں میں سسی پنوں کی رومانی داستان کو موضوع شاعری بنایا ہے۔اور سسی کی غفلت، اس کے عشق کی شدت اور تلاش محبوب میں بیاباں نوردی کو اپنی شاعری میں زیادہ اہمیت دی ہے۔ان کی داستان تمثیلاتی یعنی *Allegorical* انداز لیے ہوئے ہے۔

''شاہ عبداللطیف کی شاعری'' ۱۲ کے زیرِ عنوان اس مضمون کا مرکزی خیال اردوداں طبقے میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کومتعارف کرانا اور یہ بتانا ہے کہ شاہ لطیف کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں اوران کی شاعری کن کن مضامین پر مشتمل ہے۔انھوں نے واضح کیا ہے کہ شاہ لطیف کا کلام دو اصناف یعنی بیت اور وائی پر مشتمل ہے۔مزید یہ کہ نہ صرف شاہ کی شاعری میں بلکہ سارے کلاسیکی شعراء کے کلام میں اسی اعتبار سے ہندی شاعری کی روایت ہی کا ایک روپ نظر آتا ہے کہ اس میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ہے لیکن یہ روایت اس طرح ہندی شاعری سے مختلف ہے کہ ہندی شاعری میں عام عورت کے جذبات اس کی زبانی ادا ہوئے ہیں اور سندھی شاعری میں عام عورتوں کے خیالات اور جذبات عام علاقائی کہانیوں کی ہیروئنوں کی زبانی ادا ہوئے ہیں۔یہ قصے علامتی اور تلمیحی انداز کے ہوتے ہیں اوران میں کہانی کا تسلسل بالکل نہیں ہوتا۔اس کے باوجود ان کو تمثیل یا الگوری (*Allegory*) کہا جا سکتا ہے۔ شاعران داستانوں میں کہانیوں کے بجائے ان کے خاص خاص مقامات سے متعلق اظہار کرتا ہے۔شاہ کی شاعری پر یہ اثر رومی کی شاعری سے ہوا ہے جو بہت ہی فنی بصیرت اور بڑے شعور کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔شاہ نے مولانا روم کی تکنیک کو تقریباً الٹ دیا ہے۔رومی جو نقطہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ایک کہانی سناتے ہیں۔شاہ لطیف یا دوسرے سندھی کلاسیکی شاعر کہانیاں نہیں سناتے بلکہ ایسی کہانیاں استعمال کرتے ہیں جو علاقے میں عام طور پر مشہور ہیں اوران کے ایسے مقامات سے متعلق شاعری کرتے ہیں۔ جن سے کوئی نقطہ پیدا ہوتا ہو۔اس فرق نے مولانا روم کے مقابلے میں سندھی شاعروں اور شاہ لطیف کی شاعری میں ایجاز،اختصار اور جامعیت پیدا کر دی ہے۔آگے چل کر شاہ لطیف کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور دیگر شعرا کے کلام سے ضروری انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ شاہ لطیف کے کلام پر مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار کا پرتو ہے اور شاہ لطیف نے کلامِ رومیؒ سے استفادہ کیا ہے۔فکروفن کے حوالے سے جہاں متعدد شعرا کے کلام کے نمونے بیان کیے ہیں وہاں شاہ لطیف کے کلام سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور آخر میں اپنی بات اس طرح مکمل کی ہے کہ شاہ کے کلام میں مضامین اور اندازِ بیاں کا بڑا تنوع ہے اوران کی شاعری سندھی شاعری کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بھی مشرقی مزاج رکھتی ہے اور ہمارے لئے قطعی اجنبی نہیں ہے۔بلکہ ہم جس قدر اس کا مطالعہ کریں گے تو وہ ہمیں کسی بھی طرح ہماری تہذیبی اقدار اور روایت سے مختلف نظر نہیں آئے گی۔

''شاہ کا رسالہ اور سندھی موسیقی'' ۱۳ میں الیاس عشقی نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالے کے تناظر میں واضح کیا ہے کہ سندھ میں موسیقی کے ایسے آثار موجود ہیں کہ ہم اس دور کی موسیقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔مختلف علاقوں اور ادوار کی موسیقی پر بحث کرتے ہوئے وہ ایک ماہرِ موسیقی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔چوں کہ آپ ریڈیو پاکستان پر بھی براڈ کاسٹر رہے شاید وہیں سے موسیقی کے حوالے سے یہ مہارت حاصل ہوئی ہو مگر جہاں سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے خوب ہے اور موسیقی پر آپ کی دسترس کا غماز ہے۔انھوں نے اپنے مضمون میں یہ بات واضح کی ہے کہ یہ اعتراف کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ سندھی موسیقی پر شاہ صاحب کے بے حد احسانات ہیں اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاہ کے رسالے کی ترتیب اور اس کے کلام کے گانے کے انداز نیز سُروں کی ترتیب اوران سُروں کی شکلوں کا سندھ کے کونے کونے میں گایا جانا بڑی حد تک شاہ کے کلام کی مقبولیت کا مرہونِ منت ہے۔

''جامع کمالات امیر خسرو (سندھی زبان اور سندھی موسیقی)'' [۱۴] میں الیاس عشقی نے امیر خسرو اور ان کی تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے۔ مضمون میں امیر خسرو کے سوانحی خاکے اور ان کی تصانیف پر تو مفصل اظہارِ خیال کیا گیا ہے مگر ان کے تنقیدی نظریات کے حوالے سے کچھ نہیں کہا گیا۔ الیاس عشقی نے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے امیر خسرو کی خدمات کو ناقابلِ فراموش قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر خسرو نے پاک و ہند کی علاقائی زبانوں کے علاوہ سندھی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ سندھی موسیقی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ سندھ کی موسیقی میں دو راگ ایسے ملتے ہیں جو امیر خسرو کی ایجاد کہے جا سکتے ہیں۔ ایک راگ ''سُر یمن کلیان'' ہے جو شاہ لطیف کے راگوں میں بھی شامل ہے اور ان کے رسالے کا ایک باب بھی اس نام سے موسوم ہے۔ دوسرا راگ ''زنگولہ'' ہے۔ یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ اس سمپورن راگ کو سندھ میں جھگلو اور پنجاب میں جھگلا بھیرویں کے نام سے گاتے ہیں۔

''شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سندھی موسیقی'' [۱۵] کے زیرِ عنوان لکھا گیا یہ مضمون گذشتہ مضمون (شاہ کا رسالہ اور سندھی موسیقی) کا تکملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں درحقیقت اس بات کو آگے بڑھایا گیا ہے کہ سندھ میں موسیقی کی تدوین، تزئین اور عملی اظہار کی روایت سے شاہ صاحب کا کیا تعلق رہا ہے اور کلاسیکی سندھی شاعری اور علاقائی موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان دونوں کا معیار اور سرچشمہ شاہ صاحب کا رسالہ ہے۔ الیاس عشقی کا کہنا ہے کہ شاہ کے رسالے، شاہ کے راگ اور عام سندھی سُروں کو سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سندھی موسیقی ہلکی پھلکی اور انتہائی پُر تاثیر موسیقی ہے اور شاہ صاحب نے اس قسم کی موسیقی کو اپنے ذوق اور وجدان سے نکھارا اور سنوارا ہے۔

ڈاکٹر الیاس عشقی نے سندھی روایت میں اردو کلام کے حوالے سے ''رسالہ'' [۱۶] کے زیرِ عنوان یہ مقالہ تحریر کیا ہے جس میں ابتداء شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالے کے سُروں (ابواب) کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے اور پھر اردو داں قاری کے لیے شاہ کے کلام کو سمجھنے اور جاننے کی اہمیت بیان کی ہے وہ رقم طراز ہیں کہ شاہ لطیف اور سندھی کلاسیکی شعراء کے کلام اور پیغام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس روایت کو سمجھا جائے جس میں یہ شاعری کی گئی یا کی جاتی ہے اس مختصر سے تعارف کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اردو داں قاری اس پس منظر اور ماحول سے متعارف ہو سکیں گے۔ جس میں سندھی شاعری پروان چڑھی ہے اگر اردو داں طبقہ اس قسم کی شاعری سے مانوس ہو جائے اور اردو شعراء وائی اور بیت کی اصناف کو اختیار کر لیں تو ان نئی اصناف کا اضافہ ہوگا۔ اردو اور سندھی شاعری میں مزید قربت پیدا ہوگی اور خاص کر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کو سمجھنے کے لئے راہ ہموار ہوگی۔ پھر اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

''سندھی شاعری کے تراجم'' [۱۷] کے زیرِ عنوان اس مقالے کے آغاز میں ترجمے اور مترجم کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو اور مترجم کے لیے اہلیت و صلاحیت کی بات کی گئی ہے اور متعدد مثالوں کے ذریعے اچھے مترجم کا مقام و منصب بیان کیا ہے۔ سندھی شاعری کے تراجم میں اوّلیت شاہ کے رسالے کو حاصل ہے علاوہ ازیں دیگر شعرا کے کلام اور ان کے انگریزی، فارسی اور اردو ترجموں کا ذکر ہے اور اردو ترجموں کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے متعدد شعرا کے کلام اور تراجم کے معائب و محاسن کا ذکر ہے۔ سندھی سے ترجمہ کیے جانے والے مختلف مترجمین کے کلام سے مثالیں اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے تراجم بھی مقالے میں شامل کیے ہیں۔ جن

شعرا کے کلام کا ترجمہ سندھی سے اردو، انگریزی، چینی اور روسی زبان میں کیا گیا ہے ان کا ذکر بھی ہے۔ مقالے میں زیادہ تفصیل شاہ کے رسالے کے ترجمے کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے تراجم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے ساتھ ساتھ گا ہے بہ گا ہے ترجمے کا یہ عمل عرصۂ دراز سے جاری ہے اور قدیم و جدید شعرا کے سندھی کلام کے تراجم ہو رہے ہیں۔

''اردو رسالے کا ایک باب، سُر یمن کلیان'' ۱۸ کے زیرِ عنوان مقالے کا آغاز رسالے کی ترتیب سُروں (ابواب) میں کیے جانے کی تفصیل سے ہوتا ہے۔ پھر مختلف سُروں اور ان میں بیان کی جانے والی داستانوں کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد ان کے فکری و فنّی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ نیز بیت، وائی اور رباعی کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے اور مصرعوں کے اوزان پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں سُر یمن کلیان کی داستانِ اوّل اور وائی بیان کرنے سے پہلے سُر یمن بتایا گیا ہے اور اسی سُر میں پیش کی جانے والی داستان بیان کی ہے۔ یہ تفصیل بیان کرتے ہوئے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے ایک لوک کہانی کی طرف تلمیح و اشارہ کیا ہے جس میں کراچی کے قرب و جوار میں ایک شاہراہ پر موکھی نامی ایک ساقیہ کا شراب خانہ تھا جس کی دور دور شہرت تھی۔ انھوں نے واضح کیا ہے کہ شاہ صاحب نے اس سُر میں زہر آلود شراب اور موکھی کو تلمیح ہی نہیں بلکہ تمثیل کے انداز میں بھی پیش کیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عشق کا منتہا اور آخری منزل اس حقیقت کا انکشاف ہے جو موت پر منتج ہوتا ہے۔ سُر یمن کلیان کی شاعری کے موضوعات یہی ہیں۔

ڈاکٹر الیاس عشقی نے ''سُر کا پایتی'' ۱۹ کے زیرِ عنوان لکھے گئے اس مقالے میں ایک باب (سُر) کا پایتی کی وضاحت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس باب میں چرخے چلانے/ سُوت کاتنے والی عورتوں کا بیان ہے جسے عام طور پر صوفیانہ شاعری کا موضوع خیال کیا جاتا ہے اور مسلمان صوفی شعرا نے اپنے کلام میں اسے خوب برتا ہے کیوں کہ اس تمثیل کے ذریعے ان کا نیکی اور انسان دوستی کا پیغام آسان اور مؤثر طریقے سے پہنچ جاتا ہے اور یہ تمثیل قرآن کریم کی سورہ نحل کی آیت ۹۴ کے ابتدائی حصّے سے ماخوذ ہے۔ اس سُر میں منصور حلاج کا ذکر بھی آجاتا ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح کتائی کے عمل سے بنتا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا ہے کہ اس سُر کا انداز علامتی، تلمیحاتی، استعاراتی اور تمثیلی ہے۔ چرخا گرہستی کی علامت ہے اس سے خوشحالی کا بھی تعلق ہوتا ہے۔ اچھے اعمال کی طرف ترغیب ہوتی ہے۔ دنیا اور آخرت کا تعلق سمجھ میں آجاتا ہے۔ گھر کے تقدس اور خاندانی رشتوں کی نزاکت پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ صوفی شعرا نے اس مضمون کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ آخر میں اس سُر کی داستان اور وائی کو مقالے کا حصّہ بنایا گیا ہے۔

''سندھی زبان اور اس کے الفاظ'' ۲۰ کے زیرِ عنوان مضمون میں زبانوں کے باہمی میل جول اور ایک دوسری زبان پر اس کے اثرات کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اپنے اس بھرپور تنقیدی مضمون میں سندھی زبان کی ابتدا اور ارتقا کی تفصیل نیز مختلف نظریات اور وادیٔ مہران میں بولی جانے والی زبانوں/ بولیوں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ الیاس عشقی نے گرم کے قانون اور شاہ کے سُر یمن کلیان کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اصوات کے حوالے سے تفصیلی گفتگو میں واضح کیا ہے کہ اس ضمن میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل پر سندھی زبان کی اصل و نسل اور اس کے دوسری زبانوں سے اثر قبول کرنے کا دارومدار ہے۔ آخر میں آپ نے مختلف زبانوں کو

ایک دوسرے سے قریب کرنے کے حوالے سے ماہرینِ لسانیات کی توجہ اور اہمیت پر زور دیا ہے تا کہ ذہنوں میں لسانی تعصب کی جڑیں کمزور ہوں اور ہر زبان دوسری زبان کی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہو۔ مضمون الیاس عشقی کی زبان دانی کا بھرپور عکاس ہے۔

''چھوکرا.....چھوکری'' ۲۱ میں الیاس عشقی نے ایک سندھی لفظ کو موضوع بنایا ہے اور اس کو بنیاد بناتے ہوئے تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ گو کہ یہ ایک مختصر مضمون ہے اور محض ایک لفظ کی بنیاد پر رقم کیا گیا ہے مگر اس میں الیاس عشقی نے تحقیقی انداز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سرائیکی اور راجستھانی زبانوں اور الفاظ کی ساخت اور املا کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کس طرح ان زبانوں کے درمیان لسانی روابط ہیں جن کی دریافت سے یہ زبانیں قریب آسکتی ہیں۔ اس مضمون سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ الیاس عشقی مختلف زبانوں پر کتنی دسترس رکھتے تھے۔

''شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حقیقی عظمت'' ۲۲ کے زیرِ عنوان اس مضمون میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شخصیت کو ان کی شاعری کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ ابتدا میں اس پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہمیں عظیم شعرا کو اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ڈھال کر دنیا کے سامنے لانے کے بجائے انھیں اس طرح پیش کرنا چاہیے جیسے وہ ہیں۔ اس ضمن میں پانچ مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر پی ایچ ٹی سورلے، اس کی کتاب *Musa Paruagan* اور اس کتاب میں شاہ عبداللطیف کے بیان و مقام کی تفصیل ہے۔ مفصل بحث کرتے ہوئے الیاس عشقی نے لکھا ہے کہ عظیم شعرا کا آپس میں مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، نہ ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک زبان کے عظیم شاعر کو دوسری زبان کے بڑے شاعر پر ترجیح دینا بھی کوئی دانش مندی کی بات ہے؟ جو لوگ ایسا کرتے ہیں نہ وہ کسی زبان کی کوئی خدمت کرتے ہیں اور نہ کسی شاعر کو فائدہ پہنچاتے ہیں بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی آفاقی اقدار سے واقف نہیں ہیں۔ شاہ صاحب کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ عوامی شاعری اور کلاسیکی شاعری کے درمیان واقع ہوئے ہیں۔ ان میں عوامی شاعری کی بھی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور وہ کلاسیکی شاعری کے انداز سے بھی واقف ہیں اس لیے ان کا شمار دونوں طرف کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے شاعروں کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ وہ جس قدر عظمت کے قابل ہیں اس میں کسی قسم کی کمی یا اضافے کا امکان نہیں ہے اور آخر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عظمت کے حوالے سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ہم شاہ کی حقیقی عظمت کو جاننا چاہتے ہیں تو ان باتوں سے بلند ہو کر شاہ کی حقیقی شاعرانہ حیثیت کو دریافت کرنا ہے۔ اس لیے کہ یہ باتیں شاہ کی عظمت کو ثابت نہیں کرتیں بلکہ اسے چھپاتی ہیں.....ضرورت سے زیادہ تقدس نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو بھی نقصان پہنچایا ہے اور شاہ کو بھی نقصان ہو رہا ہے، چنانچہ اب ان باتوں سے قطع نظر کر کے شاہ کا مطالعہ سیاسی، ثقافتی، لسانی اور ہر قسم کی عصبیت سے بلند ہو کر کرنا پڑتا گا۔ اس صورت میں ہم شاہ کی حقیقی عظمت کو دریافت کر سکیں گے۔ یہ شاہ کا ہم پر قرض ہے جو ہمیں چکانا ہے۔

''موئن جو دڑو (حقیقت اور افسانہ)'' ۲۳ کے عنوان سے الیاس عشقی نے اپنے اس مقالے کی بنیاد اپنے ایک بزرگ دوست مرحوم سید نور علی شاہ ضامن حسینی کی تحریروں سے اخذ کردہ مواد پر رکھی ہے اور جو کچھ اس مقالے میں بیان ہوا ہے وہ ان کا اپنا ہے

جس کی ذمّہ داری انھوں نے خود قبول کی ہے۔اپنے آبا و اجداد کی بیان کردہ روایت کو حضرت امام رضاؑ نے امام حسینؑ کی زبانی نقل کیا ہے جس میں اصحاب الرس کے بارے میں ایک سائل کے استفسار پر حضرت امیر المومنینؑ کی زبانی جواب ان کے وصال سے تین دن قبل نقل کیا ہے۔روایت کے بعد برعظیم پاک و ہند کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالی ہے اور مختلف علاقوں اور اقوام کے عروج و زوال کا ذکر ہے اور موئن جو دڑو۲۴؎ کا تفصیلی ذکر ہے اور بتایا ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے اور اس کے قرب و جوار میں ایسی قدیم بستیاں بھی دریافت ہوئی ہیں جن پر اصحاب الرس کی بارہ بستیوں کی باقیات کا گمان ہوتا ہے۔وادیٔ سندھ میں صنوبر کے درختوں اور شیر ہاتھی اور گینڈوں کے پائے جانے اور حالات کے بدلنے پر غائب ہو جانے کا ذکر ہے۔مزید برآں وہ کہتے ہیں کہ آج اصحاب الرس کا وادی سندھ میں آباد ہونا، وادی میں ان کا آنا، بستیوں کو آباد کرنا، دریائے سندھ سے نہری نظام کا نکالنا ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن ہر پرانی تہذیب زمین کے اندر ہی نہیں بعض اوقات باہر بھی بعض نشانیاں باقی چھوڑ جاتی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ باقیات کسی ایسی قوم کی چھوڑی ہوئی نشانیاں نہیں ہیں۔اس کے بعد سندھ کی قدیم تاریخ سے ملنے والے ایسے الفاظ سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جن پر غور کر کے اصحاب الرس اور ان کے اس وادی میں وجود سے متعلق غور کر سکتے ہیں۔آخر میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اصحاب الرس اور موئن جو دڑو کے بارے میں ان دونوں تہذیبوں میں کنوئیں کو اہمیت حاصل تھی اصحاب الرس نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں قید کیا تھا جہاں وہ فوت ہو گئے اور موئن جو دڑو کی تہذیب میں بھی ان کے شہری کنوئیں کو تقریباً مرکزی اہمیت حاصل ہے۔یہ ہر سطح کی تہذیب میں موجود رہا ہے اور یہ کنواں ہمارے لئے لمحہ فکر یہ فراہم کرتا ہے۔شہر کے دریا کے کنارے پر واقع، دریا سے نہریں نکالنے ،کنویں کو اہمیت حاصل ہونے کی وجہ سے موئن جو دڑو اور اصحاب الرس کے شہروں میں بڑی مماثلت ہے اس طرح اصحاب الرس کا قصہ اگرچہ ابھی دونوں تہذیبوں کو ایک ثابت کرنے کے سلسلے میں ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس افسانے میں دوسرے افسانوں کی طرح حقیقت بن جانے کے امکانات موجود ہیں جن سے متعلق گفتگو کی گئی ہے قدیم اقوام اکثر ایسے حالات سے گزری ہیں اس لئے اس امکان کو افسانہ سمجھ کر رد نہیں کر دینا چاہیئے بلکہ ان امکانات پر غور کرنا چاہئے جو یہ نئی معلومات سامنے لاتی ہے اس کے لئے ایک آزادانہ اور غیر متعصب ذہن سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی و تعلیقات

۱؎ (۱) شیخ محمد ابراہیم خلیل ۱۹۰۰ء میں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔آپ نے بمبئی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کر کے ''ویانا'' سے جلدی امراض میں امتیاز کی سند حاصل کی۔کچھ دن کراچی میں رہے پھر مستقلاً حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ایک پیشہ ور ڈاکٹر اور ادبی مشاغل چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن کے مترادف ہیں مگر ڈاکٹر خلیل نے اپنی ذات سے اس کو بچ ثابت کر دیا۔سندھی اور اردو کی ادبی سرگرمیاں انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں۔آپ سندھی اور اردو زبانوں کے شاعر بھی ہیں اور شاعر بھی۔اردو کی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ (ڈاکٹر شاہدہ بیگم،سندھ میں اردو، اردو اکیڈمی سندھ کراچی،ص ۳۰۷)

(۲) شیخ محمد ابراہیم نے جے پور کی ایک ادبی تقریب (آل انڈیا مشاعرہ) میں علامہ رزی جے پوری کو بحیثیت کمپیئر دیکھا تھا جہاں وہ ایک

میڈیکل کانفرنس میں گئے تھے جو جے پور میں میڈیکل کالج کے قیام کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ڈاکٹر ابراہیم خلیل چوں کہ خود شاعر تھے لہٰذا انھوں نے اس مشاعرے میں بصد شوق شرکت کی تھی۔جس کے سیکرٹری (کمپیئر) علامہ رزی جے پوری تھے چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے علامہ رزی جے پوری کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

۲ سرٹیفکیٹ آف ڈومیسائل میں آپ کی پاکستان آمد کی تاریخ دس جولائی ۱۹۴۸ء تحریر ہے۔

۱ (۱) سخن ور، حصہ سوم، مرتبہ سلطانہ مہر، مہر بک فاؤنڈیشن امریکہ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۴۔۲۸۳۔

(۲) آصف فرخی/ترجمہ مختار کریمی، ایک عمر کا متعلمانہ نظم وضبط، کتابی سلسلہ ''تحریر'' میر پور خاص، سلسلہ نمبر ۹، اگست ۲۰۰۲ء، صفحہ ۳۵۔

۲ سلطان جمیل نسیم، ''الیاس عشقی، کچھ یادیں، کچھ باتیں''، ماہنامہ ''سیپ'' کراچی، شمارہ نمبر ۷۰، خاص نمبر ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۳۲۔

۳ ایضاً۔

۴ (۱) سیدہ محسنہ خاتون نقوی، مولانا رزی جے پوری کے حالات زندگی اور شاعری، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، ۷۹۔۱۹۷۸ء شعبۂ اردو، جامعہ سندھ، ص ۹۔

(۲) احترام الدّین احمد شاغل، تذکرۂ شعرائے جے پور، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۸ء۔

۵ سخن ور، حصہ سوم، مرتبہ سلطانہ مہر، مہر بک فاؤنڈیشن امریکہ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۳۔

۶ سندھ یونی ورسٹی شعبۂ اردو کے ڈاکٹر سید محمد جاوید اقبال نے بتایا کہ شعبۂ اردو کے مجلّے ''تحقیق'' میں جو مقالات ومضامین شائع ہوئے وہ ڈاکٹر الیاس عشقی نے ڈاکٹر نجم الاسلام کی خواہش پر لکھے اور ان دونوں کے درمیان ادب واحترام کا ایسا تعلق تھا کہ جب الیاس عشقی کو نجم صاحب کے گھر پر آنا ہوتا تھا تو طے شدہ وقت پر ڈاکٹر نجم الاسلام اپنی بیٹھک کا دروازہ کھلا رکھتے تھے اور جیسے ہی الیاس عشقی پر نظر پڑتی آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتے اور گلے لگاتے تھے۔الیاس عشقی ان کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہ بیٹھتے تھے۔

۷ ڈاکٹر الیاس عشقی کا سندھی زبان کا شعری اور نثری سرمایہ بھی احقر نے جمع کر لیا ہے جو جلد ہی طباعت کے مراحل سے گزرتے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

۸ یہ پیش لفظ ۱۸ مئی ۱۹۹۹ء کو تحریر کیا گیا۔

۹ ڈاکٹر الیاس عشقی کا یہ مضمون ''سچّے چہرے (سندھی لوک کہانیوں کے نسوانی کردار)''، کے عنوان سے ''ادبی رابطے لسانی رشتے'' میں اختر انصاری اکبر آبادی نے شائع کیا تھا۔بعد میں آپ نے کچھ ترمیم واضافے کے ساتھ ''نسوانیت کی آواز'' کے عنوان سے لکھا اور یہی غیر مطبوعہ مضمون احقر نے اپنے ایم۔فل کے مقالے میں بھی شامل کیا تھا۔

۱۰ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (۱۶۸۹ء۔۱۷۵۲ء) سندھی زبان کے مقبول ترین صوفی شاعر، ہالہ حویلی میں پیدا ہوئے والد کا نام سیّد حبیب تھا جو بعد میں کوٹری سندھ میں آ گئے۔جوانی میں آپ سیر وسیاحت کے لیے نکلے اور ملتان، جیسلمیر، لسبیلہ، مکران اور کاٹھیا واڑ کے علاقوں میں گھومتے پھرتے حیدر آباد کے قریب ایک ٹیلے کو اپنا مسکن بنایا اور ایک نئی بستی آباد کی۔سندھی میں ٹیلے کو بھٹ کہتے ہیں اسی نسبت سے آپ بھٹائی کہلائے۔یہ بستی اب بھٹ شاہ کے نام سے مشہور ہے۔آپ کا مطبوعہ کلام ''شاہ جو رسالو'' سندھی میں ہے۔مختلف داستانیں شاہ صاحب کی شاعری میں جذب ہو کر صرف داستانیں ہی نہ رہ گئیں بلند ہو کر فلسفۂ حیات بن گئیں۔''شاہ جو رسالو'' سب سے پہلے جرمنی سے ڈاکٹر ٹرمپ نے شائع کرایا۔اس کا منظوم اردو ترجمہ شیخ ایازؔ نے کیا جسے سندھ یونیورسٹی نے شائع کیا۔آپ کا انتقال بھٹ شاہ میں ہوا۔جہاں غلام شاہ کلہوڑو نے ۱۷۵۴ء میں اُن کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

(سیّد قاسم محمود، انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، الفیصل اردو بازار لاہور، پانچواں ایڈیشن جولائی ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۷)۔

۱۱ یہ مضمون سہ ماہی ''فنون'' لاہور کے شمارہ ۲ جلد ۴ دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

۱۲ یہ مضمون ماہ نامہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد کے شمارہ ۵، ۶ جلد ۲۷، ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

۱۳ ایضاً۔

۱۴ یہ مضمون ماہ نامہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد کے شمارہ ۱، ۲ جلد ۳۲، ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

۱۵ یہ مضمون سندھ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے مجلّے ''پرکھ'' میں شائع ہوا تھا۔ رسالے پر اشاعت کا سال اور شمارہ نمبر درج نہیں ہے۔ تاہم الیاس عشقی کے پاس موجود شمارے پر ۱۴ مئی ۱۹۷۸ء کی تاریخِ وصولی درج ہے اور اندازہ ہے کہ یہ اسی دوران شائع ہوا ہوگا۔

۱۶ یہ مقالہ ماہ نامہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد کے شمارہ ۸، ۹ جلد ۲۸، ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔

۱۷ یہ مضمون سب سے پہلے ۱۹۸۴ء میں غلام ربانی آگرو اور خالد اقبال یاسر کے مرتب کردہ پاکستانی زبانوں کے ادب پر مجالسِ مذاکرہ کے مقالات کا مجموعہ ''ادبی رجحانات'' مطبوعہ اکادمی ادبیات اسلام آباد میں شامل تھا۔ بعد ازاں الیاس عشقی نے اس مقالے میں کچھ ترمیم کی اور ''آزادی کے بعد سندھی ادب کا ارتقاء'' میں خالد اطہر نے شامل کیا۔ یہ کتاب بھی اکادمی ادبیات اسلام آباد نے دسمبر ۱۹۸۴ء میں شائع کی۔ پھر یہ مقالہ تیسری بار ماہ نامہ تخلیق لاہور کے شمارہ ۱۔۲ جلد ۱۹ سال ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

۱۸ یہ مقالہ ماہ نامہ ''سیپ'' کراچی کے شمارہ ۵۱ (سہ ماہی اشاعتِ خاص) غالباً ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔

۱۹ یہ مقالہ ماہ نامہ ''دائرے'' کراچی کے شمارہ ۵ جلد ۲، نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

۲۰ یہ مضمون اختر انصاری اکبرآبادی کی مرتب کردہ کتاب ''ادبی رابطے، لسانی رشتے'' میں شائع ہوا تھا جسے مجلسِ ادب حیدرآباد نے شائع کیا تھا۔ کتاب پر اشاعت کا سال درج نہیں ہے۔ اشاعت کے بعد جا بجا لفظوں اور جملوں میں کاٹ چھانٹ اور ردّ و بدل کیا گیا۔ اس میں ترمیم و اضافے کے بعد یہ مضمون دوبارہ شائع نہیں ہوا۔

۲۱ یہ مضمون مکتبہ نئی قدریں حیدرآباد کے ''ادبی مجلّہ'' طبع اوّل فروری ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔

۲۲ یہ مضمون سہ ماہی ''نئی عبارت'' حیدرآباد سندھ کے شمارہ ۴، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

۲۳ یہ مقالہ سہ ماہی ''لوحِ ادب انٹرنیشنل'' حیدرآباد کے شمارہ ۲، ۴، ۱ جلد ۴، ۵ (اپریل تا دسمبر ۲۰۰۲ء) میں شائع ہوا۔

۲۴ موئن جودڑو (MOHENJODARO) لاڑکانہ (سندھ) سے ۲۵ میل جنوب میں ایک قدیم شہر کے آثار، جن کی قدامت کا اندازہ ۲۵۰۰ سال قبل مسیح لگایا گیا ہے۔ اس زمانے میں مصر اور بابل کی تہذیب اپنے شباب پر تھی۔ ۱۹۲۲ء میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کے افسر سر جان مارشل نے اس شہر کے کھنڈر دریافت کیے، جنھیں سندھیوں نے موئن جودڑو (مردوں کے ٹیلے) کا نام دیا۔ اس شہر کی کھدائی سے پہلے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ برصغیر کی تاریخ کی ابتدا آریاؤں کے حملوں سے ہوئی، مگر موئن جودڑو کے کھنڈرات سے یہ انکشاف ہوا کہ ہندوستانی تاریخ اس سے بھی پرانی ہے اور آریہ حملہ آوروں سے پیشتر ہندوستانی سرزمین کئی تہذیبوں کا عروج و زوال دیکھ چکی ہے اور اس کی داستانِ حیات اور تمدّن اتنا پرانا ہے جتنا مصر و چین کا۔ موئن جودڑو کے کھنڈروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر جس تمدّن کا آئینہ دار ہے وہ آریائی تمدّن سے بلند معیار کا تھا۔ اس کے تخت و تاراج ہونے کی داستان ہنوز بے نقاب نہیں ہو سکی اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ قوم جو پختہ اینٹوں کی مکانوں میں رہتی تھی، جس کی صاف ستھری گلیاں حفظانِ صحت کے اصولوں کا پتا دیتی ہیں، جس کے تجارتی جہاز عراق وغیرہ جایا کرتے تھے، کیونکر اور کب صفحۂ ہستی سے مٹ گئی! قرین قیاس یہ ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے بسنے والی یہ قوم کسی غیر متوقع طوفان کی نذر ہو گئی۔

سرجان کی کھدائی سے پتا چلتا ہے کہ موئن جوڈرو کے بسنے والے مذہبی احساس رکھنے کے باوجود اگلی دنیا کی فکر میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اہلِ مصر اور اہلِ عراق کی طرح یہ لوگ مندروں اور شاہی مقبروں کی تعمیر پر اپنا وقت خرچ کرنے کے بجائے ایسی عمارات کی تعمیر پر اپنا وقت خرچ کرنے کے بجائے ایسی عمارات کی تعمیر پر صرف کرتے جو مشترکہ مفاد اور تمدّنی اغراض کے لیے ہوتیں۔ چنانچہ ان کی بہترین تعمیرات عوامی غسل خانے یا حوض وغیرہ تھے۔ جب اس شہر کی ترقی یافتہ تہذیب کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تو متاخرین نے اپنا وقت مندروں اور عبادت گاہوں کی تعمیر کی نذر کر دیا اور کسی منصوبے کے تحت آبادی کی تعمیر کا طریقہ ترک کر کے صدیوں تک ایسی گلیاں بنائیں جن میں گندے پانی کے نکاس کا بھی کوئی انتظام نہ تھا (اردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور، فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، تیسرا ایڈیشن، طباعت دوم، جولائی ۱۹۸۷ء، ص ۹۶۶)۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ اکبر آبای، انصاری، اختر: س ن، ''ادبی رابطے، لسانی رشتے ۱''، مجلس ادب، حیدر آباد۔

۲۔ _____: س ن ''ادبی رابطے، لسانی رشتے ۲''، مجلس ادب، حیدر آباد۔

۳۔ اطہر، خالد: ۱۹۸۴ء، ''آزادی کے بعد سندھی ادب کا ارتقاء''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

۴۔ شاہدہ بیگم، ڈاکٹر: جون ۱۹۸۰ء، ''سندھ میں اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

۵۔ مہر، سلطانہ (مرتب): ۱۹۹۸ء، ''سخنور'' سوئم، مہر بک فاؤنڈیشن، امریکا۔

۶۔ شاغل، احترام الدّین: ''تذکرہ شعراء جے پور'' علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۸ء۔

۷۔ آگرو، غلام ربانی، خالد اقبال یاسر: ۱۹۸۴ء، ''ادبی رجحانات''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

جرائد ورسائل

۱۔ ''پرکھ'' (سندھی) شعبۂ سندھی، سندھ یونیورسٹی، ۷۷۔۱۹۷۶ء۔

۲۔ ''تحریر'' ادبی سلسلہ، میر پور خاص، سلسلہ نمبر ۹، اگست ۲۰۰۲ء۔

۳۔ ''تخلیق'' ماہ نامہ، لاہور، شمارہ ۱، ۲۔ جلد ۱۹، ۱۹۸۸۔

۴۔ ''دائرے'' ماہ نامہ، کراچی، شمارہ ۵۔ جلد ۲، نومبر ۱۹۸۸ء۔

۵۔ ''سیپ'' ماہ نامہ، کراچی، شمارہ ۵۱۔۱۹۸۷ء، شمارہ ۷۰۔۲۰۰۱ء۔

۶۔ ''سیپ'' ماہ نامہ، کراچی، شمارہ ۵۱۔۱۹۸۷ء، شمارہ ۷۰۔۲۰۰۱ء۔

۷۔ ''فنون'' سہ ماہی، لاہور، شمارہ ۲۔۱۹۶۶ء۔

۸۔ ''لوحِ ادب'' انٹرنیشنل سہ ماہی، حیدر آباد، شمارہ ۴۔۲۔۱: ۲۰۰۲ء۔

۹۔ ''نئی عبارت'' سہ ماہی، حیدر آباد دو، شمارہ ۴۔۱۹۹۶ء۔

۱۰۔ ''نئی قدریں'' ادبی مجلّہ، حیدر آباد، طبع اوّل فروری ۱۹۹۳ء۔

۱۱۔ ''نئی قدریں'' ماہ نامہ،حیدرآباد،شمارہ۶۔۵:۱۹۷۳ء ، ۲۔۱:۱۹۷۶ء ، ۹۔۸:۱۹۸۳ء۔

دائرۃ المعارف (ENCYCLOPAEDIAS)

☆ اردوانسائیکلوپیڈیا: جولائی ۱۹۸۷ء، تیسراایڈیشن،طباعت دوم، فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ،لاہور۔

☆ انسائیکلوپیڈیاپاکستانیکا: جولائی ۲۰۰۴ء، مرتبہ سیدقاسم محمود، پانچواں ایڈیشن،الفیصل اردوبازار،لاہور۔

غیرمطبوعہ مقالہ

☆ ''مولانا رزی جے پوری حالاتِ زندگی اور شاعری''، سیّدہ محسنہ خاتون، مقالہ برائے ایم اے، شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، ۱۹۷۹ء۔